R. NO. 218/57
REGD. NO-L922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ اشاعت
۲۲-۱۵ -۸ -۱

جلد ۲۸، شمارہ ۳۲ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ اگست ۱۹۶۹ء

آل احمد سرور

دو قابل قدر شخصیتیں

شادانی اور ہمایوں کبیر

وجاہت حسین عندلیب شادانی کے انتقال سے اردو دنیا ایک ممتاز محقق اور نقاد، ایک قابل قدر شاعر اور ایک پختہ کار معلم سے محروم ہوگئی۔ شادانی رام پور کے رہنے والے تھے اور مدرسہ عالیہ کے مشہور استاد اولاد حسین شاداں سے نسبت کی وجہ سے اپنے کو شادانی کہتے تھے۔ انھوں نے لاہور میں اور پھر انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں فارسی کے معلم ہوگئے۔ شادانی صاحب کی نظر فارسی اور اردو کے کلاسیکل ادب پر بہت گہری تھی وہ ایک اچھے شاعر تھے اور انھوں نے پریم پجاری کے نام سے کئی کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ ان کی شاعری اور افسانہ نگاری دونوں پر ایک دلکش رومانیت کی چھاپ تھی۔ شادانی صاحب ایک زمانے میں رسالہ ساقی میں نہایت پابندی سے لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے دور حاضر کی غزل گوئی کا جو تجزیہ کیا تھا اس میں ان سے غلطی یہ ہوئی کہ فانی، جگر، اصغر جیسے شعرا کے اشعار پر اس زمانے کی حقیقت نگاری کے تصور کے مطابق نکتہ چینی کی حالانکہ شاعرانہ صداقت اور رمزیت غزل میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کی یہ کتاب کمزور ہے مگر تحقیق کی روشنی میں "ایک بلند پایہ کارنامہ ہے۔ شادانی نے ناسخ اور شیفتہ کے متعلق عام تصور کی خامی کو واضح کرکے ایک مفید خدمت انجام دی۔ ان کی شاعری میں رومانیت ضرور ہے مگر اس کے پیچھے ایک گہرا اور سچا احساس ملتا ہے جو اسے قابل قدر اور دلکش بنا دیتا ہے۔ انھیں فن پر بڑی قدرت تھی۔ وہ شروع میں فردیات پر زیادہ زور دیتے تھے مگر بعد میں انھوں نے غزلیں بھی لکھیں اور ان میں سے اکثر میں ایک تسلسل یا ایک کیفیت ملتی ہے۔ شادانی کے کلاسیکی ذوق نے شروع میں انھیں آزاد نظم کی شعریت کو محسوس کرنے سے باز رکھا اور ان کی وہ کوششیں جو راشد اور میراجی کی نظموں کو برابر کے بے قافیہ مصرعوں (بلینک ورس) کی نظمیں بنانے کے لئے صرف ہوئیں سراہی نہیں جا سکتیں مگر شادانی کے رچے ہوئے ذوق اور کلاسیکی فنی معیاروں سے ان کی گہری واقفیت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے۔ ان کی نثر نہایت صاف ستھری اور واضح ہوتی تھی اور اس میں ایک دلکشی بھی تھی۔ شادانی میں خاصی انانیت تھی اور وہ اپنے مقابلے میں کسی کو کم خاطر میں لاتے تھے، مگر ان کی علمیت اور ان کے ادبی ذوق کے سبھی قائل تھے۔ انھوں نے سنجیدہ اور قابل قدر تحریروں کا خاصا سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کی گفتگو نہایت دلکش ہوتی تھی اور وہ واقعی بڑے مزے کے آدمی تھے۔ اردو ادب کی تاریخ میں شادانی کی شخصیت اور شاعری کا ذکر ہمیشہ عزت اور احترام سے کیا جائے گا۔ خواہ ان کے بعض خیالات سے اتفاق ممکن نہ ہو۔

پروفیسر ہمایوں کبیر بنگلہ زبان کے ایک ممتاز شاعر اور ادیب ہندوستان کے ایک قابل قدر دانش ور اور اس دور کی ادبی، تہذیبی، علمی اور سیاسی زندگی کے ایک اہم رکن تھے۔ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی میں امتیاز کے ساتھ تعلیم ختم کرنے کے بعد آکسفورڈ سے (MODERN GREATS) میں امتیاز کے ساتھ ڈگری لی تھی۔ ہندوستان واپس آکر کچھ عرصے تک وہ کلکتے میں فلسفے اور تاریخ کا درس دیتے رہے۔ بعد میں طالب علموں کی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا اور بہت جلد علمی اور سیاسی حلقوں میں اپنے لئے ایک جگہ بنالی۔ کرپس مشن کی آمد پر وہ مولانا آزاد کے سکریٹری کی حیثیت سے مذاکرات میں شریک رہے اور بعد میں وزارت تعلیمات میں سکریٹری ہوگئے۔ انھوں نے مولانا آزاد سے طول طویل نشستوں میں ان کی زندگی کے حالات دریافت کئے اور پھر انگریزی میں ان کی طرف سے (INDIA WINS FREEDOM) کے نام سے کتاب لکھی جس کے تیس صفحے مولانا مرحوم کی ہدایت کے مطابق سربمہر ہیں اور ۸۸ ۱۹ میں منظر عام پر آئیں گے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر کئی حکومتوں میں وزیر بھی رہے اور انھوں نے سائنسی تحقیق اور تہذیبی امور کی وزارت

میں اپنی جاندار شخصیت کی وجہ سے بڑی زندگی پیدا کر دی۔ وہ علمی اور ادبی اداروں کی برابر مدد کرتے رہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور انجمن ترقی اردو ہند سے انھیں گہری دلچسپی تھی اور انھوں نے مختلف موقعوں پر اس کی بڑی مدد کی۔ ان کا بڑا کارنامہ ٹیگور صد سالہ تقریبات کا بین الاقوامی پیمانے پر انتظام ہے۔ انھیں کی وجہ سے یہ صد سالہ تقریبات ہندوستان میں اور دوسرے ملکوں میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئیں۔ ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے اس موقع پر جو بین الاقوامی سیمینار ہوا تھا اور جس میں آلڈس ہکسلے ازرا پاؤنڈ اور ... جیسے ممتاز اشخاص شریک ہوئے تھے، اس کی صدارت میں پروفیسر کبیر نے جس جامعیت اور علمیت کا ثبوت دیا تھا، وہ ارباب نظر کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ میری دعوت پر انھوں نے شعبۂ اردو کے ایک سیمینار کا افتتاح کیا تھا جو تنقید کے بنیادی مسائل پر بحث کے لئے ۱۹۶۹ء میں ہوا تھا اور اس میں عالمی معیاروں کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ پروفیسر کبیر نہ صرف ایک ممتاز مصنف اور دانشور تھے، وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے۔ وہ آخر عمر میں بنگال کی سیاست کی وجہ سے کانگریس سے الگ ہو گئے تھے اور ان کے آخر عمر کے رول سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر وہ بلاشبہ ایک سچے محب وطن، ایک بڑے قومی کارکن، ایک ممتاز مصنف اور ادیب تھے جنھیں ہندوستان کے سارے جلوۂ صد رنگ سے بہت محبت تھی۔ افسوس ہے کہ تریسٹھ سال کی عمر میں ملک و قوم ایسی قابل قدر شخصیت سے محروم ہو گیا۔

اردو تعلیم کے اداروں کا فیڈریشن بنانے کی تجویز

الٰہ آباد۔ اردو کمیٹی کے زیر اہتمام ایک جلسے کی صدارت کرتے ہوئے ریاض الدین صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج نے یہ تجویز پیش کی کہ جن اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے ان کا ریاستی سطح پر ایک فیڈریشن بنا دیا جائے تاکہ اردو تحریک کو منظم طور پر آگے بڑھایا جا سکے۔

انھوں نے اردو دوستوں کی بے حسی اور بے عملی کی شکایت کی اور اس بات پر زور دیا کہ ہر محلے اور گاؤں میں سرپرستوں سے اس مطلب کی درخواست صدر مدارس اور انسپکٹر کے پاس بھجوائی جائے کہ ان کے بچوں کو اردو کے ذریعہ تعلیم دی جائے۔

ریاض الدین صاحب نے کہا کہ اگر سرکاری کتابیں چھپی نہیں ہوتیں تو دوسری کتابیں جو نصاب کے مطابق تیار کی گئی ہیں ان سے کام چلایا جا سکتا ہے اور اگر پرائمری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے تو بچوں کو آسان قاعدہ پڑھا کر ثانوی درجات میں اردو دلوائی جا سکتی ہے۔

محمود احمد صاحب ہنر نے اپنی تقریر میں مہاراشٹر، آندھرا اور بہار کی مثال دی جہاں اردو کی حالت بدرجہا بہتر ہے کیونکہ وہاں کے اردو دوست عمل پر یقین رکھتے ہیں۔ نثار احمد صاحب اور فرید بیگ صاحب نے بھی جلسے کو خطاب کیا۔

● قومی آواز

اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کا مسئلہ

حیدرآباد۔ مجلس اتحاد المسلمین کے ایک وفد نے جناب سلطان صلاح الدین اویسی ایم۔ ایل۔ اے کی قیادت میں چیف منسٹر سے نتیجہ خیز گفتگو کی۔ وفد نے اس بات پر زور دیا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ چیف منسٹر نے اس مطالبہ پر عاجلانہ غور و خوض کرنے کا وعدہ کیا۔ نظم و نسق، عدلیہ اور تعلیم میں اردو کے مقام اور موقف سے متعلق مختلف تجاویز کی تیاری کے لئے چیف منسٹر نے آمادگی ظاہر کی جس کا تفصیلی اعلان کیا جائے گا۔

● رہنمائے دکن

زبانوں کی تعلیم کے لئے لسانی تجربہ گاہیں

نئی دہلی۔ تعلیمی تحقیق اور تربیت سے متعلق قومی کونسل نے پروفیسر ایچ۔ اس۔ اس۔ اپا کے زیر صدارت لسانی تجربہ گاہوں کے سلسلے میں جو کمیٹی مقرر کی تھی اس نے اس بات پر زور دیا ہے کہ بچوں اور بالغوں کو مختلف زبانیں سکھانے کے لئے لسانی تجربہ گاہوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہئے۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ لسانی تجربہ گاہ کے استعمال سے کوئی زبان سکھانے کی مدت میں تقریباً نصف کی کمی ہو سکتی ہے۔ وقت کی اس بچت سے سائنس، ریاضی اور دیگر مضامین کی تعلیم کے لئے زیادہ وقت مل سکتا ہے۔

کمیٹی کا خیال ہے کہ ہر کالج اور ہائی اسکول میں لسانی تجربہ گاہ کا ہونا ضروری ہے۔ وسائل کی کمی کے پیش نظر فی الحال یہ کیا جا سکتا ہے کہ تربیتی کالجوں کے علاوہ چند مرکزی لسانی تجربہ گاہیں بھی قائم کی جائیں جن سے مختلف اسکول کالج فائدہ اٹھا سکیں۔ اس طرح ملک میں دس ہزار سے کم تجربہ گاہوں کی ضرورت ہوگی۔ لسانی تجربہ گاہوں میں تحریری اسباق، ٹیپ، فلموں اور دوسرے صوتی و بصری ذرائع نیز ٹیلی ویژن کا استعمال بھی ضروری ہے۔ کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ لسانی تجربہ گاہوں میں غیر ملکی زبانوں کے علاوہ دیسی زبانوں کی تعلیم کا انتظام بھی ہونا چاہئے۔

● قومی آواز

پروفیسر عباس علی خاں بیخود کا انتقال

۔ اگست ۱۹۹۹ء کو خان بہادر رضا علی وحشت مرحوم کے ممتاز شاگرد عباس علی خاں بیخود نے کلکتہ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم مغربی بنگال کی ایجوکیشن سروس سے ۱۹۶۲ء میں بحیثیت پروفیسر ریٹائر ہوئے۔ وحشت صاحب کے بعد وہ سنٹرل کلکتہ کالج (سابق اسلامیہ کالج) کے شعبۂ اردو و فارسی کے صدر تھے اور کلکتہ یونیورسٹی میں ایم اے کے کلاس لیا کرتے تھے۔ کلکتہ کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں بھی وہ اپنے استاد کے قائم مقام اور گذشتہ تہذیب کی یادگار تھے۔

ادارہ ہماری زبان مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے اور اس سانحے پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

ایش کمار

غالب اور غم

غم نے غالب کو آزردہ تو کیا لیکن اس کی شاعری کو چمکا دیا۔ مصائب سے دوچار ہونے سے پہلے شاعری اس کے لئے صرف تفریح طبع کا مشغلہ تھی لیکن اب ایک سنجیدہ سرمایۂ حیات بن گئی۔ غم اور عشق یہ دو موضوع ہیں جن پر غالب کی بیشتر شاعری مشتمل ہے۔ لیکن عشق میں بھی اکثر ہجر، مایوسی اور ناکامی کا رونا ہے۔ جب کبھی شاذ و نادر دورِ جام اس تک پہنچتا ہے۔ اسے شک گزرتا ہے کہ کہیں زہر آلودہ نہ ہو۔ اور جب ایک بار صرف ایک بار بغیر التجا بوسہ نصیب ہوتا ہے، تو عام لذت اس خیال سے خاک میں مل جاتی ہے، کہ یہ عادت غیر کی صحبت میں پڑی ہوگی۔ غرضیکہ غالب کا عشق بھی ستم زدہ ہے۔

غالب کی شاعری نے غم میں پرورش پائی لیکن وہ میر کی طرح چیخ پکار کی شاعری نہیں۔ زندگی میں تو غالب مسلسل مضطرب اور بے چین رہا۔ لیکن شعر لکھتے وقت اس نے طبیعت پر قابو پالیا۔ غالب ان شاعروں میں سے ہے جنھوں نے شاعری تجربہ کی بنا پر لکھی۔ میر اور غالب اردو شاعری میں غالب سے پہلے کوئی تیسرا نام نہیں سوجھتا جو اس صف میں رکھا جائے۔ اکثر شاعری دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔ قافیہ پیمائی اور الفاظ بندی یہاں تک کہ ایک ہی شعر کئی شاعروں سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میر اور غالب مختلف ہیں۔ ان میں انفرادی رنگ ہے۔ ذاتیت ہے۔ دل کی تڑپ ہے، جذبہ کی شدت و تجربہ کا نچوڑ ہے۔

تجربہ کی شاعری کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ کہ جو کچھ شاعر محسوس کرے بعینہٖ وہی بیان کر دے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے کہا ہے۔

"THE MORE PERFECT THE ARTIST, THE MORE COMPLETELY SEPARATE IN HIM WILL BE THE MAN WHO SUFFERS AND THE MIND WHICH CREATES."

جذبہ شعری کی شکل اختیار کرنے سے پہلے شاعر کے تخیل اور دماغ سے گزرتا ہے۔ اور کیمیاوی مرکب کی طرح کچھ اور بن جاتا ہے۔ میر اس بھید کو نہ سمجھ سکا۔ اس کا دردبھرا دل شاعری میں پکار رہا تھا۔ غالب نے اس بھید کو خوب سمجھا۔ شعر لکھتے وقت اس نے طبیعت پر قابو پالیا۔ اس کی شاعری صرف جذباتی نہیں، بلکہ تفکر سے لبریز ہے۔ اس میں سکون و توازن ہے۔ میر اور غالب کا موازنہ کرتے وقت ہمیں شیلی اور کیٹس کی یاد آتی ہے۔ شیلی چیخ اٹھتا ہے۔

"I DIE, I FAINT, I FAIL."

"I FALL ON THE THORNS OF LIFE, I BLEED."

میر کا گریہ و زاری اس سے کم نہیں

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا
رات کو سینہ بہت کوٹا گیا

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
دردمندی میں کٹی ساری جوانی اس کی

ہمیشہ رونا، کڑھنا، سینہ کوبی بر زبان کرنا میر کو اپنے غم سے محبت ہے۔ وہ چھٹکارا نہیں چاہتا۔ بلکہ گلے لگاتا ہے اور فخر محسوس کرتا ہے۔

اور محزوں دل بھی ہم سے تھے ولے
میر سا ہو سکے ہے کب کوئی

جب نالہ کش ہوا وہ تب خلقیں رلائیں
تھا میر دل شکستہ یا کوئی نوحہ گر تھا

اب کیٹس کو لیجئے۔ اس کی نظم ODE TO A NIGHTINGALE دنیا کی نہایت دردناک نظموں میں سے ہے لیکن اس میں ذاتی درد نہیں۔ وہ شروع تو اپنے آپ سے کرتا ہے۔

"MY HEART ACHES AND A DROWSY NUMBNESS PAINS MY SENSE"

لیکن بہت جلد شخصیت سے ہٹ کر اس کا غم دنیا کا غم بن جاتا ہے، جو تفکر اور تخیل کی پیداوار ہے۔

"..... THE WEARINESS, THE FEVER AND THE FRET HERE, WHERE MEN SIT AND HEAR EACHOTHER'S GROAN; WHERE PALSY SHAKES A FEW, SAD, LAST GREY HAIRS, WHERE YOUTH GROWS PALE AND SPECTRE-THIN

خلیل الرحمٰن اعظمی

غزل

بدلتا رہتا ہے کیا رنگ آسماں دیکھو
فصیل شہر سے باہر کا بھی سماں دیکھو
گزر کے آئے ہیں یہ لوگ کس جہنم سے
دلوں کی اوٹ سے اٹھتا ہوا دھواں دیکھو
اسی کی ضد پہ پیا زہر خود شناسی کا
یہ زندگی ہمیں لے جائے گی کہاں دیکھو
ٹھکیں گے جا کے مگر کون سے جزیرے پر
کھلا ہے اب تو خیالوں کا بادباں دیکھو
خوشی کے نام پہ کس طرح مسکرائے ہیں
یہ انتہائے غرورِ فسردگاں دیکھو
یہ لا کے چھوڑ دیا کون سے دوراہے پر
کہاں گئے مرے خوابوں کے کارواں دیکھو
چھڑا ہوا ہے فضاؤں میں سازِ صد آہنگ
بکھر رہی ہیں صداؤں کی پتیاں دیکھو
فسانے سنتے رہو گمشدہ خرابوں کے
یہ بس رہی ہیں مگر کیسی بستیاں دیکھو

"AND DIES, WHERE BUT TO THINK IS TO BE FULL OF SORROW AND LEADEN-EYED DESPAIR."

غالب اپنے غم کو دنیا کا غم تو نہ بنا سکا۔ لیکن اس کی حکیمانہ طبیعت نے ذاتی جذبہ کو فلسفیانہ بنا دیا۔ ضرب پڑی۔ گریہ و زاری اڑ گئی۔ مقابلہ کیجئے۔ دونوں شاعروں کا اپنی موت کے موضوع پر میر کہتا ہے۔

کیا کروں ناچار ہوں مرنے کو اب تیار ہوں
دل کی روز و شب کی بیزاری سے جی گھبرا گیا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

اسی موضوع پر غالب کی ایک پوری غزل 'میرے بعد' کی ردیف میں ہے۔

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

غالب کو اپنی موت کا رنج نہیں۔ رنج اس بات کا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد کوئی حسن پرست دنیا میں نہیں رہے گا۔ حسن کا وقار مٹ جائے گا۔ حسین عشوہ و ادا بھول جائیں گے۔ حنا اور سرمہ کا استعمال بے سود ہوگا۔ کیونکہ دیکھنے اور داد دینے والی کوئی آنکھ نہیں رہے گی۔ عشق ماتم میں سیاہ پوش ہو جائے گا۔ غالب کہاں ہے ان اشعار میں۔ وہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور حسن و عشق کی بے حرمتی پر افسوس کرتا ہے کتنا ضبط و سکون ہے غالب کے اشعار میں۔

ایک اور جانا پہچانا شعر لیجئے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کتنا درد بھرا شعر ہے۔ لیکن درد آہ و زاری سے نہیں بلکہ اشارتاً ظاہر کیا گیا ہے۔ بس اتنا کہا ہے "اس شکل سے" اور پڑھنے والے کے تخیل پر چھوڑ دیا ہے۔ میر دس اشعار یہ جتانے کے لئے کہتا کہ اس کی زندگی کس شکل سے گزری لیکن پھر بھی وہ تحقیق وہ اثر پیدا نہ ہوتا جو شعر کے دوسرے مصرعے نے پیدا کر دیا ہے جس میں درد اور شوخی دونوں کی ملاوٹ ہے۔ یا یہ شعر لیجئے۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

اس شعر میں غالب صرف "اتنا" کہہ کر خدا سے گلہ کرتا ہے کہ اس نے ایک ہی دل دیا جو برداشت کرنے کا اہل نہیں۔ کتنا گہرا درد ہے اس شعر میں۔ لیکن صرف ذاتی جذبہ کا بیّن اظہار نہیں۔ تخیل کا غم ہے۔ جو نہیں زمیں سے چھوتا ہے۔ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور دیر تک قائم رہتا ہے۔

غالب نہ صرف غم پر قابو پا لیتا ہے۔ غم سے حظ بھی اٹھانا جانتا ہے ؎

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے

کبھی کبھی غم کا مضحکہ بھی اڑاتا ہے۔

گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی برد لیالی نے مجھے

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

جوش گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

یہ خوش طبعی اور ہمت عالی غالب کے دل و دماغ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ شاعری میں ہی نہیں اپنے خطوط میں اپنے غم کے ساتھ کھیلتا دکھائی دیتا ہے۔

"میاں۔ بے رزق جینے کا ڈھنگ مجھے آ گیا ہے۔ تم اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا۔ آگے خدا رازق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا۔ تو غم تو ہے۔"

"مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں نہ قید۔ نہ رنجور ہوں نہ تندرست۔ نہ خوش ہوں نہ ناخوش۔ نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جئے جاتا ہوں۔ باتیں کئے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ گاہ پئے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت۔ جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت۔"

"پنشن بھی گئی اور ریاست کا نام و نشان خلعت دربار بھی گیا۔ خیر جو کچھ ہوا چونکہ موافق رضائے الٰہی ہے۔ اس کا گلہ کیا۔"

"قضا و قدر پر چھوڑ دو۔ نیرنگیٔ قدرت کے تماشائی بنو۔۔۔۔ میں ایک کونے میں بیٹھا نیرنگیٔ روزگار کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔"

غالب تمام عمر دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھ کر تماشا دیکھتا رہا۔ دست سوال دراز کرنا اس کی نگاہ میں ذلیل ترین فعل تھا۔ جس کا وہ بار بار مرتکب ہوا۔ لیکن اسے بھی اس نے تماشا ہی جانا۔

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

غالب کا غم نہ قنوطی تھا۔ نہ فراری۔ وہ ایک صحت مند انسان کا غم تھا۔ اس میں تمیز کی تاریکی اور سقامت نہیں تھی اور نہ میر کی طرح اسے غم سے محبت تھی۔ غم کو غم سمجھ کر اس نے اس کا مقابلہ کیا۔ چوٹیں کھائیں۔ لیکن نہ دنیا کے آلام سے بھاگا۔ نہ اس کے آسائش کی مذمت کی۔ اپنی قسمت کو کوستا رہا۔ شوخی اور بذلہ سنجی سے ہنسی اڑاتا رہا۔ لیکن مغلوب نہ ہوا اور نہ ہی ترک دنیا یا رہبانیت کا قائل۔ اپنے عزیز شاگرد ہرگوپال تفتہ کو جو دنیا کی مصیبتوں سے تنگ آ کر سادھو بننا چاہتا تھا۔ ایک خط میں لکھا۔

"کیوں ترک لباس کرتے ہو۔۔۔ ترک لباس سے قید ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پئے گزارہ نہ ہوگا سختی و سستی و رنج و آلام کو ہموار کرو۔ جس طرح ہو اسی صورت بہر صورت گزرنے دو۔"

ٹیگور نے لکھا ہے کہ اگر ہم اس لئے آنسو بہائیں کہ ہمیں چاند میسر نہیں تو ہم تاروں کو بھی نہ دیکھ سکیں گے۔ بھیڑ جتنا چلاتی ہے اتنا گھاس کے لقموں سے محروم رہتی ہے۔ غالب کہتا ہے۔

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہئے

نہ ہو بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے　　طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

غالب جانتا تھا کہ غم زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ موت کے سوا اس سے چھٹکارا نہیں

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

زندگی ایک کشمکش ہے جس سے بچنا محال ہے

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی　　ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

دنیا میں دو شدید ترین غم ہیں غمِ دوراں و غمِ جاناں۔ غمِ دوراں انسان کی شخصیت کو پامال کرتا ہے خودداری کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ ذلت و خواری کا باعث ہے۔ غمِ جاناں دل کی تربیت کرتا ہے۔ شخصیت کی تکمیل کرتا ہے غمِ دوراں سے نجات دلاتا ہے۔ ؎

غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

غم سرِ حسن کے چاقو کی طرح ہے جو نشتر بھی ہے علاج بھی۔ درد بھی ہے دوا بھی۔ ایک شمع کی مانند ہے جو جلاتا بھی ہے روشن بھی کرتا ہے۔ ؎

آتشم آہ بہ فروغ و فراغ
روشنیٔ شمعم و نورِ چراغ

بجھا ہوا چراغ کس کام کا۔ آسودہ ہے۔ جلنے کی اذیت سے محفوظ ہے لیکن بے رونق ہے۔

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سود چراغِ کشتہ ہے

غم دل و دماغ کو روشن کرتا ہے۔ سنگِ فساں کی مانند ہے جس سے عقل تیز ہوتی ہے ؎

تیزیٔ فکرِ من از قسمتِ گردوں چہ خطر
سختیٔ دہر شود تیغِ مرا سنگِ فساں

جب خدا سے شکوہ کرتا ہے کہ کیوں مجھے آلام و مصائب کے شکنجے میں گرفتار کر رکھا ہے تو جواب ملتا ہے کہ نادان کیا تو جانتا نہیں کہ نغمہ سنج بلبلوں کو ہی گرفتار کیا جاتا ہے۔ کبوتر اور باز کو کون پکڑتا ہے۔ ؎

مفتوں کوٹوی

راکھی

رکھتی ہے نہاں جذبۂ الفت راکھی
کرتی ہے عطا انس کی دولت راکھی
دھاگا نہیں، رشتہ ہے یہ جانبازی کا
تحفہ نہیں ہے جان کی قیمت راکھی

•

اظہارِ محبت کا طریقہ راکھی
انسانیت باہم کا قرینہ راکھی
تاریخِ گذشتہ سے ہے ثابت مفتوںؔ
مر دینے کا اسے لیتی ہے ذمہ راکھی

•

راکھی ہے حقیقت میں دلوں کا بندھن
آزاد مراسم کا نرالا بندھن
وہ قید کہ آزادیاں جس پر ہوں نثار
بندھن بھی، لیکن یہ ہے دلکشا بندھن

تو بلبلی ہمیں کہ بدامِ آدمی اسیر　　اندر قفس ز بہرِ نوا کرد روزگار

غم کی چوٹ کھائے بغیر خدا تک بھی رسائی محال ہے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی　　مشکل ہے تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

یہ تھا غم کا راز جسے میر نہ سمجھ سکا۔ یا اسے غالب نے سمجھا یا اقبال نے۔ اقبال کہتا ہے۔

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال　　غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال

اس موضوع پر غالب اور اقبال کا موازنہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اقبال غالب کی طرح رنج و الم سے دوچار نہ ہوا۔ اس کی زندگی مقابلتاً آرام اور کامیابی کی زندگی تھی۔ اور اس کی بہترین شاعری کا موضوع کچھ اور ہی ہے والدہ کی موت نے اسے چوٹ پہنچائی اور اس کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" دنیا کے ادب کے بہترین مرثیوں میں سے ہے اور دل کے نازک ترین تاروں کو چھوتی ہے ؎

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار؟
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

لیکن کہیں بھی اقبال غم کو خارجی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے سمجھتا ہے محسوس نہیں کرتا۔ اس کی غم کی شاعری تفکر کا نتیجہ ہے۔ روح کی پکار نہیں۔ فلسفی کا بیان ہے، شاعر کی صدا نہیں۔ "فلسفۂ غم" اس کی بہترین نظموں میں سے ہے غم کے اسرار کا انکشاف ہے۔ غم کیا کرتا ہے نہ کہ غم کیا ہے۔

غم جواں کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائرِ دل کے لئے غم شہپرِ پرواز ہے　　راز ہے انساں کا دل غم انکشافِ راز ہے

پُرشکوہ شاعری ہے۔ موضوع اور تشبیہ دونوں لحاظ سے شاندار ہے لیکن کیا یہ دل کی گہرائیوں تک اترتی ہے۔ تفکر ہے، تاثر نہیں۔ مقابلہ کیجئے غالب کا۔

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل　　انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے　　میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ　　جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

اور پھر میر کو کیٹس سے مشابہت دی گئی ہے۔ اقبال کو پوپ سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔ پوپ کی شاعری کی بابت کولرج نے لکھا تھا کہ اس میں

شاعرانہ خیالات نہیں ہیں۔ خیالات کو شاعرانہ لباس پہنا دیا گیا ہے یہی فرق غالب اور اقبال کا ہے۔ غالب غم کو شعر بنا دیتا ہے۔ اقبال غم کی بابت شعر لکھتا ہے۔

میتھیو آرنلڈ نے ورڈز ورتھ کے متعلق لکھا کہ قدرت نے ورڈز ورتھ کو نہ صرف شاعری کا مواد دیا بلکہ خود اس کی نظمیں لکھیں۔ یہی اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ غم نے اقبال کو شاعری کا مواد دیا، لیکن غالب کے لئے خود غزلیں لکھیں۔

اقبال رجائی تھا۔ اسے غم کی شاعری سے نفرت تھی۔ بار بار شکوہ کرتا ہے۔ کہ مشرق کے شاعر غم میں غلطاں رہتے ہیں اور اسی کو ہی شاعری کا مقصد سمجھتے ہیں۔

گریہ طفلانہ در پیمانہ اش　　گلفتہ آبے تماشا خانہ اش

ناخوشے افسردۂ آزردۂ　　از لگد کوب شبیاں مردۂ

اقبال براؤننگ کی طرح ہمت اور حوصلہ کا شاعر ہے۔ مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی تلقین کرتا ہے ساحل کی آسودگی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ حیات جاوداں کے لئے ضروری ہے۔ کہ دریا میں کود پڑو اور لہروں کے تھپیڑے کھاؤ۔

بیا را زم بر ساحل کہ آنجا　　نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز　　حیات جاوداں اندر ستیز است

یہ ٹھیک ہے۔ لیکن جہاں اقبال کہتا ہے۔ تم ایسا کرو۔ غالب کہتا ہے میں ایسا کرتا ہوں

کہ ستیزم با قضا از دیر باز　　خویش را بر تیغ عریاں می زنم
شعب با شمشیر و خنجر می کنم　　بوسہ بر ساطور و پیکاں می زنم

رجائی اقبال موت کو بھی زندگی کی تجدید سمجھتا ہے۔ یہ ایک قسم کی شام ہے جو صبح میں بدل جائے گی ایک قسم کی نیند ہے جو عارضی اور آرام دہ ہے۔

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے　　خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح　　مرقد انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی　　ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

نہایت لطف اندوز اشعار ہیں۔ اور قابل تحسین۔ لیکن یہ دماغ کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ دل کی تڑپ کا اثر نہیں۔ کیا کبھی اقبال نے موت کا اس طرح خیر مقدم کیا۔ جب تک انسان آلام سے محفوظ رہتا ہے فلسفی بننا آسان ہوتا ہے۔ غالب کا شعر ہے۔

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

موت کو صحیح معنوں میں اقبال نہیں غالب جانتا تھا جس کے سات بچے یکے بعد دیگرے اس کا شکار ہوئے۔ نہایت عزیز بھائی داغ مفارقت دے گیا۔ عزیز تر بھتیجا بھی چل بسا۔ موت کی بابت غالب کی شاعری نہایت سادہ تصنع سے بری، خلوص و جذبے سے پر ہے۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

غالب اقبال کی طرح فلسفی نہیں تھے کیٹس اور شیکسپیئر کی طرح شاعر تھے، جنھوں نے انسانی خواہشوں امنگوں اور مایوسیوں کا نہایت گہرا تجربہ کیا اور ذاتی تجربہ کی بنا پر شاعری کی۔ اقبال کا نقطۂ نگاہ شاعرانہ یا نفسیاتی نہیں فلسفیانہ ہے۔ وہ ایک مفکر کی طرح انسانی الجھنوں کا خارجی طور پر مطالعہ کرتے ہیں۔ ذاتی تجربہ کا اس میں دخل نہیں۔ شاعری جزویست از پیغمبری کے قائل ہیں۔ ان کی توجہ دل کی گہرائیوں کی طرف مبذول نہیں ہوتی۔ بلکہ دنیا کی رہنمائی کی طرف۔

غالب کے سامنے کوئی مقصد نہیں تھا۔ دل گداختہ میں غوطہ زن ہو کر گوہر نکالتے اور شعر کہتے۔ ان کا تصور تھا کہ شاعری جگر میں نشتر چبھونے اور سوراخ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ؎

سخن گفتن از عرق جگر سفتن است

ایک جگہ لکھتے ہیں۔ کہ میرے کلام میں روانی کی وجہ یہ ہے کہ میں خون جگر پیتا ہوں اور زبان سے باہر نکالتا ہوں۔

اے کہ در نظم روانی دیدہ دانی کہ چیست
می خورم خون دل و می ریزد از لبہائے من

اگر شاعری اندرونی تجربہ کی پیداوار نہیں۔ تو اس کا کیا فائدہ ؎

چہ خیزد از سخنے کز درون جاں نبود
بریدہ باد زبانے کہ خونچکاں نبود

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

غبار رنگ (مجموعہ کلام)
مصنف: اندر سروپ دت ناداں
ناشر: قصر اردو۔ اردو بازار۔ دہلی
قیمت: تین روپے۔ صفحات ۱۲۸

گلشن (مجموعہ کلام)
مصنف: پریم پال اشک
ناشر: اردو پبلیکیشنز۔ اردو بازار دہلی
قیمت: دو روپے پچاس پیسے صفحات ۱۲۸

اردو شاعری میں تاج محل
مرتب: [illegible]
ناشر: اردو پبلیکیشنز۔ دہلی
قیمت: ایک روپیہ ۵۰ پیسے

مراسلات

دیوان غالب نسخۂ امروہہ کے بارے میں

— ۱ —

ہماری زبان کے تازہ شمارہ سے معلوم ہوا کہ بھوپال کے کسی سکریٹری نشر و اشاعت مجلس اردو نے (نہ جانے کیوں انھوں نے اپنا نام چھپایا ہے) ایک مراسلہ کے ذریعہ شفیق الحسن صاحب فضلی کی کسی تقریر کی رپورٹ کی ہے۔ مگر یہ رپورٹ سراسر جعلی اور بے بنیاد ہے۔ یہاں بھوپال میں ایسا کوئی جلسہ کسی انجمن کی طرف سے نہیں ہوا جس میں انھوں نے تقریر کی ہو۔ یہ انجمن مجلس اردو بھی ایک گڑھا ہوا نام ہے اور اور اس نام کا وجود پہلی بار اس رپورٹ سے سامنے آتا ہے۔

پروفیسر ابو محمد صاحب سحر کا مراسلہ پہلے ہی ہماری زبان میں شائع ہو چکا ہے اور اس پر فضلی صاحب کے تصدیقی دستخط موجود ہیں۔ سحر صاحب بھوپال کے معزز آدمی ہیں وہ غلط بیانی نہیں کر سکتے اور خود بڑی احتیاط والے آدمی ہیں۔ اس لئے انھوں نے ہماری زبان کو مراسلہ بھیجنے سے پہلے فضلی صاحب سے اس پر دستخط بھی کرائے۔ انھوں نے فضلی صاحب کی ڈائری سے اس امر کا ایک نوٹ بھی نقل کیا ہے کہ فضلی صاحب نے یہ دیوان گیارہ روپے میں توفیق احمد کے ہاتھ فروخت کیا۔

خوشی کی بات تو یہ ہے کہ غالب جیسے شاعر کا خود نوشتہ دیوان ملا فخر کی بات تو یہ ہے کہ وہ بھوپال سے ملا لیکن یہ حسد کی بات ہرگز نہیں کہ امروہہ کے توفیق احمد کے ہاتھ وہ فروخت ہو گیا۔ حق ہر حال میں حق ہے۔

• بھوپال جمیل احمد خاں

— ۲ —

ڈاکٹر حامد حسین نے ہماری زبان کے ایک حالیہ شمارے میں احتجاج کیا ہے کہ جب غالب کا خود نوشت دیوان بھوپال سے برآمد ہوا ہے تو اسے نسخۂ امروہہ کیوں کہا جائے میں اس سے متفق ہوں۔ کسی مخطوطے کو اسی شہر کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے جو اس کا آخری معلوم ماخذ ہو جہاں سے وہ دفینے سے وہ برآمد کیا گیا ہو۔ نسخۂ بھوپال، نسخۂ رام پور قدیم و جدید، نسخۂ بدایوں وغیرہ کی وجہ تسمیہ یہی ہے۔ غالب کے خود نوشت مخطوطہ کا آخری ماخذ بھوپال ہے۔ امروہہ سے اس کا چند روزہ عارضی تعلق ہے۔ فروخت کے سلسلے میں آیا ہے۔ کسی گاہک کے ساتھ باہر چلا جائے گا بشرطیکہ اس سے پہلے اسے عدالت میں نہ دھر لیا جائے۔ اسے نسخۂ بھوپال کہنے میں قباحت یوں ہے کہ ایک نسخۂ بھوپال پہلے سے موجود ہے۔ التباس سے بچنے کی راہ ہمیں ایک نظیر میں مل جاتی ہے۔ رضا لائبریری رام پور میں دیوان غالب کے دو مخطوطے ہیں جنھیں نسخۂ رام پور قدیم و نسخۂ رام پور جدید کہا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے زیر بحث نسخے کو نسخۂ بھوپال قدیم اور نسخۂ حمیدیہ کے مخطوطے کو نسخۂ بھوپال جدید کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس میں ذرا سی نفسیاتی جھجک یہ ہے کہ آخر الذکر نسخۂ اول الذکر سے ۱۵ سال پہلے دریافت ہوا تھا اسے جدید کیونکر کہا جائے۔ اس صورت سے بچنے کے لئے ہم خود نوشت نسخے کو نسخۂ بھوپال اوّل اور نسخۂ حمیدیہ کے مخطوطے کو نسخۂ بھوپال دوم کہہ سکتے ہیں اور یہ بیان تحقیقی صحت کے مطابق ہوگا۔

ایسے نادر مخطوطے کی دریافت کے بعد اس نشان دہی کی ضرورت تھی کہ یہ کہاں سے برآمد ہوا اور کس دفینے سے دریافت ہوا ہے جس طرح کسی مقالے میں کسی دوسرے کے اقتباس کے ماخذ کی نشان دہی کی جاتی ہے اسی طرح ایسے نوادر یافت مخطوطے کے ماخذ اوّل کے بارے میں نشان دہی بھی ضروری تھی تاکہ اس نوادر اس کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں بہتر رائے قائم کر سکیں۔ یہ دیکھ کر کسی قدر افسوس ہوتا ہے کہ اس نسخے سے متعلق شروع شروع میں جتنے اعلان، مراسلے اور مضامین شائع ہوئے ان میں باقاعدہ طور پر اس کے ماخذ کو پردہ ظلمات میں رکھنے کی کوشش کی گئی ہے نثار احمد فاروقی صاحب کے ۲۲ راپریل، یکم جون اور ۸ رجون کے مراسلوں میں اور جبرئیل ثانی جلال الدین صاحب کے ۱۵ رجون اور ۲۲ رجون کے مراسلوں میں کہیں بھوپال یا شفیق الحسن صاحب کا ذکر نہیں۔ حد یہ ہے کہ آج کل کے جون اور جولائی کے شماروں میں نثار احمد فاروقی صاحب اور عرشی صاحب کے جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں بھی نسخے کے ماخذ کو پراسرار تاریکی میں رکھا گیا ہے۔ عرشی صاحب نے لکھا ہے

"توفیق احمد صاحب .... کو کہیں سے دیوان غالب کا اس سے بھی زیادہ نادر اور اہم نسخہ دریافت ہوا ہے۔"

مجھے یقین ہے کہ نثار احمد فاروقی، جلال الدین اور عرشی صاحب تینوں کو اس نسخے کے ماخذ کے بارے میں صحیح معلومات رہی ہوں گی۔ ان سب کے سکوت کی وجہ مالک نسخہ کی تاکید ہوگی۔ یہ تاکید کیوں کی گئی۔ شاید انھیں اندیشہ ہو کہ ماخذ کا بھید کھل جانے پر کوئی صاحب شفیق احمد بھوپالی کو اکسا سکتے ہیں کہ وہ اس بیش بہا مخطوطے کو واپس طلب کریں یا پھر اس کی اصل قیمت خرید (گیارہ روپے) کا انکشاف ہونے پر مخطوطے کی قیمت گر جائے گی۔ میری دانست میں ان محققین کو ایک تاجر کے تاجرانہ مفادات پر تحقیق کے تقاضوں کو ترجیح دینی چاہئے تھی اور اس کی دستیابی اور ماخذ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات دینی تھیں۔ بھلا ہو اکبر علی خاں کا کہ انھوں نے یکم رجون کے ہماری زبان میں یہ آتا پتہ دے دیا کہ یہ مخطوطہ بھوپال سے ملا ہے۔ اس خبر کو پڑھتے ہی ڈاکٹر ابو محمد سحر دوڑے دوڑے شفیق احمد فضلی کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ کیا یہ مخطوطہ انھوں نے فروخت کیا ہے۔ تفصیلات معلوم کر کے انھوں نے یکم جولائی کے ہماری زبان میں پورا راز طشت از بام کر دیا۔

ایک بحث ہے کہ یہ مخطوطہ کس نے دریافت کیا۔ نثار احمد فاروقی صاحب کا فیصلہ ہے:

"میرے معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ دیوان غالب خود

توفیق احمد نے دریافت کیا" (ہماری زبان ۱۵ جولائی)

لیکن میری رائے میں یہ دریافت تو شفیق الحسن ہی کی ہے توفیق احمد نے اسے مشتہر کیا۔ ابو محمد صاحب کے ۲۲ جولائی کے مراسلے میں شفیق الحسن خاں کی ڈائری سے ۳ اپریل ۱۹۶۹ء کا یہ اندراج نقل کیا گیا ہے۔

"دیوان غالب قلمی محررہ ۱۸۲۵ء قلمی میرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب مع مکتوبات فارسی غالب قلمی مبلغ گیارہ روپے میں حافظ توفیق احمد صاحب کو فروخت کی گئی"

اور نثار احمد فاروقی صاحب کے بقول شفیق الحسن نے توفیق احمد کو یہ نسخہ یہ کہہ کر دیا تھا۔

"غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بیاض ہے"

(ہماری زبان ۱۵ جولائی ص ۶)

اگر شفیق الحسن کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ دیوان بخط غالب ہے اور اس کے زمانہ کتابت کا بھی قریبی اندازہ تھا تو توفیق احمد صاحب نے کون سی مزید دریافت کرلی بجز اس کے کہ شفیق الحسن اپنی سادہ لوحی کے سبب نسخے کی قیمت کا اندازہ نہ کرسکے اور اپنی دریافت کو توفیق احمد کے سوا کسی اور پر ظاہر نہ کیا توفیق احمد استعار فروخت کے ذریعے اسے منظر عام پہ لے آئے۔

اس مخطوطے کے ترقیمے میں کوئی سنہ درج نہیں دن اور مہینہ درج ہے۔ پھر شفیق الحسن کو ۳ اپریل ہی کو کیونکر معلوم ہوگیا کہ یہ نسخہ ۱۸۲۵ء کا مکتوبہ ہے۔ کیا نسخے میں ایسا کوئی قرینہ ہے جو اہل نظر کی نظروں سے چوک گیا ہو؟

ہماری زبان میں یہ دلچسپ خبر بھی پڑھی کہ شفیق الحسن کے مطابق یہ نسخہ توفیق احمد صاحب کو مستعار دیا گیا تھا لیکن ڈاکٹر ابو محمد صاحب کے مراسلے پر جو انھوں نے دستخط کردئے ہیں ان کا کیا ہوگا۔

● جموں گیان چند

—— ۳ ——

اس بات کی تصدیق نہیں ہوسکی کہ دیوان غالب کی ٹھیک تاریخ کیا ہے؟

انجمن ترقی اردو کی تقویم میں نے دیکھی ہے اس تقویم سے شاید جناب جلال الدین صاحب نے قدیم ترین نو دریافت دیوان غالب کی تاریخ تدوین ۱۶ رجب یوم سہ شنبہ ۱۲۳۲ھ نکالی ہے (چونکہ غالب نے سنہ ہجری کے ہندسے درج نہیں کئے اس لئے صحیح تاریخ نکالنے میں دشواری ہورہی ہے) انجمن ترقی اردو کی تقویم کی رو سے یہ تاریخ درست معلوم ہوتی ہے اگر نول کشور پریس کی تقویم میں ۱۲۳۱ھ میں ۱۶ رجب کو سہ شنبہ دن تھا جیسا کہ توفیق احمد صاحب نے اکبر علی خاں صاحب کے حوالے سے ہماری زبان کے شمارہ مورخہ ۱۵ جولائی میں مطلع کیا ہے۔ تو پھر اس طرح تقویم کے اختلاف پر ماہرین غالبیات کچھ روشنی ڈالیں کیونکہ اگر اس طرح کے اختلافات قدیم تقویم میں ہیں تو پھر قطعیت کے ساتھ کوئی بھی سنہ نکالنا ناممکن ہوجائے گا۔ ماہر غالبیات مولانا عرشی صاحب چونکہ اس دیوان کو ملاحظہ فرمارہے ہیں اس لئے ان سے درخواست ہے کہ وہ اس اختلافی مسئلہ کا حل پیش فرماکر قارئین ہماری زبان کو مطمئن فرمائیں جس طرح سے انھوں نے گذشتہ شمارہ میں غالب کی تاریخ پیدائش کا قطعی حل پیش فرمایا ہے۔

● دہلی عارف عباسی

وسکانسن میں غالب صدی کا پروگرام

کچھ عرصہ ہوا غالب صدی کے سلسلے میں وسکانسن یونیورسٹی میں ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں ہندوستانی اور پاکستانی طلبہ کے علاوہ امریکی طلبہ اور اساتذہ نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس جلسے میں شریک ہونے والوں میں چودھری محمد نعیم، ڈاکٹر کیشپ سین، شاداں ہندی، ڈاکٹر ظفری اور ڈاکٹر انیس خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ سب سے پہلے چودھری محمد نعیم نے غالب کی حیات اور شخصیت سے متعلق ان کے خطوں سے دلچسپ اقتباسات سنائے۔ اس کے بعد وسکانسن یونیورسٹی میں اردو کے مہمان پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے غالب کی شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالی۔

انھوں نے کہا کہ غالب کی شاعرانہ عظمت کا راز صرف ان کے تنوع میں یا رعنائی خیال میں، یا صرف نفسیاتی گہرائی میں یا خلاقی یا نقش گری میں نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ غالب کے ساتھ اردو شاعری پہلی بار صحیح معنوں میں زندگی کی تفسیر بن پائی۔ غالب کے یہاں اردو غزل جام جہاں نما بن گئی ہے اور اس میں قطرہ سے دجلہ کا اور جزو سے کل کا رشتہ الگ معلوم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر نارنگ کی تقریر کے بعد کئی امریکی طلبہ نے غالب کا کلام سنایا اور ان کے خطوں سے اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ ان میں کارلا میکلیکن، ایزی ایبل، کرس کنگ، ڈائل روزبری، اورین مائیکل، جم سیڈن، مائیکل ردتھ اور لام ہیمبر کے نام قابل ذکر ہیں۔ بعد میں شکاگو سے آنے والے حضرات نے اپنا کلام سنایا اور حیدر حسن کے اردو دوستوں نے بھی اپنا اور اردو کے دوسرے اساتذہ کا کلام سنایا۔ یہ نشست رات کے ایک بجے ختم ہوئی۔ اس موقع پر میموریل یونین کے لاؤنج میں غالب سے متعلق نمائش کا انتظام کیا گیا تھا۔

غالب صدی سے متعلق اس طرح کے جلسے شکاگو اور نیویارک میں بھی ہوچکے ہیں۔ غالب صدی کا ایک خاص پروگرام یہاں ASSOCIATION OF ASIAN STUDIES کے موقع پر ہارورڈ یونیورسٹی کے پڑوسی شہر بوسٹن میں ہوا۔ غالب پر الگ سے سیشن تھا جس میں اعجاز احمد صاحب نے "اشعار غالب کے ترجمے کی مشکلات" پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے "دستنبو اور غالب کی وطنیت" پر اور ڈاکٹر داؤد رہبر نے "غالب کے خطوط" پر مقالے پڑھے۔ صدارت ڈاکٹر ایمزی شمل نے کی اور ڈاکٹر بارکر، چودھری محمد نعیم، محمد عمر میمن، ڈاکٹر اسد حسین، ڈاکٹر حمید الدین، ڈاکٹر شفیق اور بہت سے دوسروں نے بحث میں حصہ لیا۔

● شکاگو نامہ نگار

انجمن کی سرگرمیاں

مئوناتھ بھنجن میں شاخ انجمن ترقی اردو ہند کا قیام

۱۰ راگست ۶۹ء کی شام کو جناب فخرالزماں صاحب کے دولت کدہ پر مقامی شاعروں، ادیبوں اور ادب نواز شہریوں کا ایک جلسہ جناب انیس ادیب صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں جناب نثار اعظمی نے اردو زبان کے مسئلے کا واحد حل انجمن ترقی اردو ہند کی مضبوط اور ہمہ گیر تنظیم کو بتلاتے ہوئے فرمایا کہ اردو کی جنگ ہر محاذ پر لڑنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم محبان اردو انجمن سے اپنا رشتہ مضبوط اور استوار کرلیں تاکہ ہم ارباب ہوش و خرد کی سرپرستی اور رہنمائی میں اپنی پیاری زبان کے لئے کوئی بہتر اور موثر رول ادا کرسکیں اور اردو کے تحفظ و بقا و ترویج و اشاعت کے لئے راہیں ہموار کرسکیں۔

حاضرین جلسہ نے بھی انجمن ترقی اردو ہند کی مقامی شاخ کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے باتفاق رائے انجمن کی تشکیل کے لئے حسب ذیل عہدیداروں کا انتخاب کیا۔

۱۔ جناب انیس ادیب صاحب۔ صدر
۲۔ جناب ایم ۔ اے ولی حسین صاحب۔ نائب صدر
۳۔ جناب نثار اعظمی صاحب۔ سکریٹری
۴۔ جناب اختر لاری صاحب۔ نائب سکریٹری
۵۔ جناب فخرالزماں صاحب۔ نمائندہ خصوصی
۶۔ عزیز احمد سیٹھ صاحب۔ خازن

جلسہ میں تمام حاضرین نے اپنا نام انجمن کی ممبرشپ کے لئے پیش کیا اور ضروری کاغذات کی نشر و اشاعت کے لئے غیر رسمی طور پر مالی اعانت بھی کی۔

● نثار اعظمی سکریٹری

ریاستی انجمن کی نشست میں یوپی حکومت کے سرکلر پر غور

لکھنؤ۔ یہاں ریاستی انجمن ترقی اردو کی ایک غیر رسمی نشست ڈاکٹر حیرن سنگھ ایم ایل سی کی قیام گاہ ۱۔ سپرنگار روڈ لکھنؤ میں مشہور ادیب ناظر کاکوروی کے (جو ریاستی انجمن کے جوائنٹ سکریٹری جناب احمد ابراہیم علوی کے والد بھی ہیں) انتقال پر ایک تعزیتی تجویز پاس ہوئی۔

جلسہ میں یوپی حکومت کے سرکلر جس کے ذریعہ ثانوی سطح پر اردو میڈیم سے تعلیم کی سہولت فراہم کی گئی غور کیا گیا اور اردو اساتذہ کی ٹریننگ کے بندوبست کا نصابی کتابوں کی تیاری کے لئے ایک ترقی اردو بورڈ ریاستی پیمانہ پر تشکیل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

صدر جلسہ ڈاکٹر حیرن سنگھ نے تمام مطالبات سے ہم آہنگی ظاہر کرتے ہوئے یوپی کونسل میں اردو کے موقف کو پیش کرنے کا وعدہ کیا۔

● قومی آواز

انجمن ترقی اردو یوپی کا دفتر

لکھنؤ۔ ریاستی انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری نے ایک اخباری بیان میں کہا کہ ریاستی انجمن کا صوبائی دفتر اگرچہ بی ۳ ریور بینک کالونی لکھنؤ میں واقع ہے پھر بھی خط و کتابت کی سہولت کے پیش نظر تمام شاخوں اور اردو خوانوں سے یہ استدعا ہے کہ وہ۔

جناب احمد ابراہیم علوی جوائنٹ سکریٹری کے پتہ پر ادارہ ہاتھی خانہ لکھنؤ ۳ پر بھی خط و کتابت کریں۔

● قومی آواز

مدھیہ پردیش میں اقلیتی زبانوں کے اساتذہ کا مسئلہ

مدھیہ پردیش گورنمنٹ ٹیچرس ایسوسی ایشن کی قیادت میں ایک وفد نائب وزیر تعلیم جناب بھوپال راؤ پوار سے ملا اور ایک میمورنڈم پیش کیا۔ میمورنڈم میں تعلیم اور ٹیچروں کے دیگر مطالبات کے علاوہ اقلیتی زبانوں کے ٹیچروں کا تقرر کرنے کا مطالبہ بھی شامل ہے۔

وفد کے لیڈر وقار صدیقی نے نائب وزیر تعلیم سے کہا کہ جہاں صوبے کے ہائر سکنڈری اسکولوں میں اب تک صرف انگریزی اور ہندی کے اساتذہ کا تقرر کیا جاتا ہے، وہاں اقلیتی زبانوں جیسے مراٹھی، اردو اور سندھی وغیرہ زبانوں کے اساتذہ نہیں رکھے جاتے، ریاستی حکومت کی یہ پالیسی لسانی ایکتا کے خلاف ہے۔

شری بھوپال راؤ پوار نے وفد کو یقین دلاتے ہوئے کہا کہ ماضی میں ریاستی سرکار کی جو بھی پالیسی رہی ہو لیکن اب اقلیتی زبانوں کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی آپ نے واضح طور پر کہا کہ جن اسکولوں میں مراٹھی اور اردو وغیرہ زبانوں کے طالب علم ہوں گے ان اسکولوں میں ان زبانوں کے اساتذہ کا انتظام کیا جائے گا۔

● وقار صدیقی

ترقی اردو بورڈ کی خبریں

دیوناگری رسم الخط میں اردو کتابیں چھاپی جائیں گی

نئی دہلی۔ ترقی اردو بورڈ نے ساری کتابوں کو فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں شائع کرنے کی سفارش کی ہے تاکہ یہ کتابیں زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچ سکیں اور اس سے معقول آمدنی ہوسکے۔ اس رقم کو اردو میں مزید کتابیں تیار کرانے کے لئے گشتی فنڈ کی حیثیت سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

یہ سفارش بورڈ نے یہاں اپنی پہلی میٹنگ میں کی، جس کی صدارت تعلیم اور نوجوانوں کے امور کے مرکزی وزیر پروفیسر وی کے آر وی راؤ نے ۱۳ر جولائی کو کی تھی۔

اس میٹنگ میں جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر علیم، آنند نرائن ملا، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر نورالحسن اور پروفیسر حبیب الرحمٰن نے شرکت کی۔

پروفیسر راؤ نے بورڈ کو بتایا کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے مترجموں کو فیلوشپ عطا کرنے سے متعلق ایک اسکیم مرتب کی ہے۔ اردو سمیت تمام بھارتی زبانوں میں مترجموں کی تربیت کے لئے ہر سال لگ بھگ ایک سو فیلوشپ دیئے جائیں گے۔

چوتھے پانچ سالہ منصوبے کی مدت کے دوران مختلف شعبوں میں اردو کی پانچ سو کتابیں شائع کرنے کی تجویز بھی رکھی گئی ہے۔ یہ شعبے ہیں علم و ادب، مقبول سائنسی ادب، بچوں کا ادب، حوالہ جاتی کتابیں اور انسائیکلو پیڈیا۔ ۱۹۶۹-۷۰ء کے دوران ۵۰ کتابیں شائع ہونے کی توقع ہے۔

بورڈ نے اس مقصد کے تحت ۳۰ سبجیکٹ پینل قائم کئے ہیں جو بورڈ کو ضروری اور مفید معلومات و مشورے فراہم کریں گے۔ ہر پینل اردو کی اچھی قابلیت رکھنے والے اعلیٰ پایہ کے تین ماہروں پر مشتمل ہے۔

بورڈ نے سفارش کی ہے کہ تصانیف اور ترجمے کے کام کا الاٹمنٹ اس سال نومبر تک مکمل ہوجانا چاہئے۔ بورڈ نے اس سال اکتوبر میں نئی دہلی میں رسالوں اور مجلوں سمیت اردو کے شائع شدہ ادب کی ایک نمائش منعقد کرنے کی تجویز بھی پیش کی ہے۔

اردو میں اصطلاحات کے سوال پر غور کرنے کی غرض سے بورڈ نے اعلیٰ سطح کی کمیٹی مقرر کی ہے۔

بورڈ نے اردو میں تاحال شائع شدہ اہم کتابوں کی فہرست شائع کرنے کی تجویز بھی پیش کی ہے۔ اس مقصد سے بورڈ نے پروفیسر محمد مجیب کی زیر صدارت ایک کمیٹی کی تشکیل کی ہے۔ موصوف بورڈ کے چیرمین بھی ہیں۔

● الجمعیۃ

اردو نصاب کی پانچ سو کتابیں شائع ہوں گی

مرکزی وزارت تعلیمات اردو کے نصابی ادب پر چوتھے منصوبے کے دوران ۵ سو کتابیں شائع کرے گی۔ ان میں سائنس، تعلیم بالغان اور بچوں کی کتابیں اور انسائیکلوپیڈیا بھی شامل ہوں گے۔

اس بات کا اعلان کرتے ہوئے مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ نے کہا: "حکومت اصولی طور پر یہ مان چکی ہے کہ اردو کی کتابیں شائع کرنے پر ایک کروڑ روپیہ صرف کیا جائے۔ منصوبہ بندی کمیشن اس سال دس لاکھ روپیہ صرف کرے گا اور آئندہ اخراجات کا انحصار اسکیم کی کارکردگی پر ہوگا۔

انھوں نے کہا کہ بورڈ ۵ سو کتابیں شائع کرے گا۔ اس کا کام اسے سونپ دیا گیا ہے۔ مرکزی وزارت تعلیمات سے متعلق مختلف تعلیمی اداروں کا ترجمہ کا کام اور طبع زاد مطبوعات بھی اردو میں شائع کی جائیں گی۔"

انھوں نے کہا کہ یونیورسٹیوں، تعلیمی اداروں، ادیبوں، مصنفوں، ماہرین اور ناشرین کو قومی تعمیر کا کام سونپنے پر بھی غور کیا جائے گا۔"

● قومی آواز

اردو کا تحفظ مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہے

معاصر "تیج" نے ترقی اردو بورڈ کے فیصلوں پر ایک مقالہ افتتاحیہ شائع کیا ہے جس میں حکومت کو اردو کی بقا و تحفظ کے سلسلے میں چند مشورے دیئے گئے ہیں۔ اس مقالے کے اہم اقتباسات قارئین ہماری زبان کے لئے درج ذیل ہیں:-

ترقی اردو بورڈ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں اردو کی کتابیں شائع کی جائیں۔ فیصلہ اچھا ہے مگر دیوناگری رسم الخط میں کتابوں کے شائع ہونے سے پہلے یہ یقین کرلینا چاہئے کہ دیوناگری حروف کے نیچے نقطے لگا کر جو فارسی حروف کی آوازیں برآمد ہوتی تھیں وہ سلسلہ پھر سے جاری کیا جائے۔ اب تو بیشتر ٹائپ ایسا ہے جن میں نیچے کے نقطے نہیں ہیں۔ اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے تک تیسرے چوتھے درجہ تک [illegible] ہیں ہندی اور اردو میں ایک ہی ہوتی تھیں صرف رسم الخط کا فرق ہوتا تھا۔ اس طریقہ پر طلبہ دونوں زبانوں سے مانوس ہوجاتے تھے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تقسیم وطن سے اردو کو سخت نقصان پہنچا ہے یعنی جس علاقہ کی زبان اردو نہیں تھی وہاں تو زبردستی اسے داخل کردیا گیا اور جہاں کی وہ زبان تھی وہاں سے خارج کردیا گیا۔ پھر بھی یہ امر قابل لحاظ ہے کہ انگریزی اور ہندی کے بعد جس زبان میں سب سے زیادہ اخبار اور رسالے چھپتے ہیں وہ اردو ہی ہے۔

ہمیں وزیر تعلیم ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے اردو زبان کے تحفظ اور تبلیغ کی جانب توجہ دی ہے۔ اگرچہ اردو کے بولنے والے کروڑوں میں ہیں، اکیلے اترپردیش میں ۷۸ لاکھ انسان اردو بولتے ہیں لیکن وہ کسی علاقہ کی زبان نہیں مانی گئی ہے۔ اس سے اردو کی ترقی کی راہ میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔

جب اردو کسی علاقہ کی زبان نہیں مانی گئی لیکن ہر علاقہ میں اس کے بولنے اور لکھنے والے پائے جاتے ہیں تو پھر مرکزی حکومت پر اردو کے تحفظ اور بقا کی خاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اردو میں عام کتابوں کا تو ذکر کیا ہے کورس کی کتابیں بھی نہیں ملتیں۔ اردو کی کتابوں کی اشاعت کے بارے میں اگر حکومت خاص دلچسپی نہ لے تو مختلف پبلشروں پر چھوڑ دینے سے کام نہ چلے گا۔

● سیاست

اخبار و اذکار

عندلیب شادانی کی وفات پر تعزیتی جلسہ

رام پور۔ صولت پبلک لائبریری میں عندلیب شادانی کی وفات پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ اس کی صدارت جناب سجاد حسین ایڈوکیٹ نے انجام دی۔ مقررین میں جناب دلدار نصری، جناب سید فریدالدین وکیل، ناظم صولت لائبریری اور جناب دور آفریدی شامل تھے۔

آخر میں سکریٹری لائبریری سید فریدالدین صاحب وکیل نے ایک تعزیتی قرارداد حاضرین کے سامنے پیش کی جسے متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔

● دور آفریدی

ادارہ فروغ اردو کا تعزیتی جلسہ

"ادارہ فروغ اردو" شب پور کی مجلس عاملہ نے اپنے ایک ہنگامی اجلاس منعقدہ ۸ر اگست ۱۹۶۹ء میں ہند و پاک کے مشہور شاعر، ادیب اور بلند پایہ محقق پروفیسر محمد عباس علی خان بیخود اور ڈاکٹر عندلیب شادانی (ڈھاکہ یونیورسٹی) کی اچانک موت پر حسب ذیل تعزیتی قرارداد منظور کی۔

پروفیسر بیخود اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کی بے وقت موت سے اردو ادب کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی بہت دنوں تک ممکن نہیں۔ ادارہ فروغ اردو کی مجلس عاملہ ان حضرات کی وفات پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتی ہے اور خدائے بزرگ و برتر سے دعا کرتی ہے کہ ان کی روح کو سکون اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

● ایم۔ اے۔ قاسم (جنرل سکریٹری)

انجمن "نئے زاویے" کی نشست

گورکھپور "نئے زاویے" کی ایک مخصوص نشست ایشوری پرشاد گہر کی قیام گاہ پر ہوئی جس کی صدارت کے فرائض گہر صاحب نے انجام دئے۔ اس نشست میں "نئے زاویے ایک ادبی سفر" کے زیر عنوان محمد احسن رضوی نے انجمن ہذا کی جملہ کارروائیوں کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ "نئے زاویے" کے سکریٹری ایم۔ کوٹھیا دی راہی نے اعلان کیا کہ یہ انجمن نہ صرف مقامی بلکہ بیرونی طور پر بھی کام کرے گی۔ باہر بھی "نئے زاویے" کے ممبران موجود ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ان مقامات پر جہاں ہمارے کم سے کم پانچ ممبران ہوں "نئے زاویے" کی شاخیں قائم کی جا سکتی ہیں۔ بعض وجوہات کی بنا پر صدر کا دوبارہ انتخاب کیا گیا اور اس کے لئے ڈاکٹر سلام سندیلوی سے گذارش کی گئی۔ موصوف نے اس عہدہ کو قبول فرما لیا ہے۔

آخر میں ایم کوٹھیا دی راہی نے اپنی ایک تازہ کہانی "لہر لہر اک ناؤ اکیلی" اور شوکت علوی نے اپنی کہانی "اس مکان میں" سنائی۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنی ایک تازہ نظم اور صدر نشست ایشوری پرشاد گہر نے اپنی متعدد غزلیں سنائی۔

● محمد احسن رضوی۔ ناظم نشر و اشاعت "نئے زاویے" گورکھپور

ادبی سنگم "جامعہ نگر" کی ادبی نشست

"ادبی سنگم" جامعہ نگر نئی دہلی کی ایک ادبی و تنقیدی نشست میں جناب سید سفارش حسین رضوی صاحب نے ایک مقالہ "ذاکر صاحب کی نثر نگاری" جناب کیلاش ماہر صاحب نے ایک غزل جناب شیام سروپ شرما صاحب نے "اردو ہندی مختصر افسانہ کی تاریخ" پر مختصر نوٹ اور جناب جے پال سنگھ ترنگ صاحب نے گیت پیش کیا۔

شیام سروپ صاحب نے تحقیقی مضمون میں ۱۹۲۵ء کے بعد کے افسانہ کی تاریخ اور اس کے ارتقاء پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی۔

● سید ظفر برنی

اردو رائٹرس ایسوسی ایشن کا ماہانہ اجلاس

اردو رائٹرس ایسوسی ایشن کی ماہانہ ادبی نشست پروفیسر ایم۔ ایچ حسن ہاشمی کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔ "اشک امرتسری" پر پروفیسر جاوید نہال نے اپنا مقالہ سنایا۔ ایم۔ اے نصر نے "ترشی کی اٹھ مرحوم" اور پروفیسر محمد امین نے "فارسی کے چند منفرد شاعر" کے عنوان سے مقالے پڑھے۔ پروفیسر محمد امین، پروفیسر حبیب الرحمن عزمی اور پروفیسر اعزاز افضل، جناب حشم الدین حشم اور محمد کمال الدین کمال نے غزلیں سنائیں۔ بحث میں حصہ لینے والوں میں حضرت جمیل، علی رضا مشتاق احمد اور سلطان رشید کے نام قابل ذکر ہیں۔

● ایم۔ اے نصر جنرل سکریٹری

کشمیر ڈیموکریٹک رائٹرز کمیٹی کا اجلاس

کشمیر ڈیموکریٹک رائٹرز کمیٹی کا دوسرا اجلاس ۳ر اگست ۱۹۶۹ء کو جواہر پارک سری نگر میں منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت جناب سوم ناتھ زتشی نے کی۔

غلام محمد بادن نے پچھلے اجلاس کی کارروائی پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد ریاض پنجابی نے اپنی اردو کہانی "رستے بند ہیں" پڑھ کر سنائی۔ شمیم احمد شمیم، شکیل الرحمن، جے۔ سی۔ شنگلی، غلام محمد، دلاور سوم ناتھ زتشی نے کہانی پر بحث میں حصہ لیا۔

نادم صاحب سری نگر سے باہر چلے جانے کی وجہ سے شرکت نہیں کر سکے۔ شمیم صاحب شریک تھے لیکن ان کے مقالے کی بجائے ڈاکٹر شنکر رینہ نے

(باقی صفحہ ۲ پر)

تبصرہ

ڈاکٹر شمیم حنفی

کتاب: غالب نمبر علی گڑھ میگزین

مرتب: بشیر بدر

غالب ان خوش نصیب شعرا میں ہیں جن کی اہمیت اور معنویت کا احساس ہر عہد میں ایک زندہ اور پائدار ادبی روایت کی شکل میں نہ صرف یہ کہ قائم رہا، بلکہ نقد و نظر کے بدلتے ہوئے معیاروں کے ساتھ ساتھ ان کی معنویت میں نت نئے زاویوں کا اضافہ بھی ہوتا گیا۔ پچھلے سو سوا سو برسوں سے انھیں سمجھنے اور سمجھانے کا سلسلہ جاری ہے۔ اس عرصے میں شعر و ادب کی بساط پر مختلف النوع رجحانات اور تحریکوں کے مظاہرے سامنے آئے اور معدوم ہو گئے، ادبی تنقید اور تجزیے نے کیسی کیسی راہیں تلاش کیں اور پھر انھیں فرسودہ اور بے نشان سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔ لیکن غالب کے طلسم کا شیرازہ منتشر نہ ہو سکا بلکہ اس میں اسرار کے مختلف گوشے برابر رونما ہوتے رہے۔ غالب صدی تقریبات کے ساتھ غالب سے دلچسپی کی لے اور تیز ہو گئی۔ یہ تقریبات چونکہ رسم و ضبط کے سحر سے آزاد نہ ہو سکی تھیں اس لیے غالب کے مطالعے میں بھی حفظ ناموس کے طور پر بالعموم عقیدت اور تکریم کے مروجہ جذبات کی تجدید ہوتی رہی اور اس مابعد الطبیعاتی رشتے کی جستجو میں تساہل اور رغبت سے کام لیا گیا جو غالب کو ہم سے قریب کرتا ہے۔ اس لحاظ سے علی گڑھ میگزین کا یہ نمبر ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کے چند شمولات زمانی فاصلوں کو سمیٹتے ہوئے غالب کو ہمارے عہد کے حسیاتی تجربوں اور عصری حقیقتوں کا ترجمان بنا دیتے ہیں۔ اس نمبر کا پہلا مضمون پروفیسر آل احمد سرور کا ہے جس میں غالب اور جدید ذہن کے باطنی روابط اور ان روابط کے علمی، تہذیبی اور فکری جواز کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ مضمون غالب کو ان کی شخصیت کے غیر منقسم حجم اور وزن کے ساتھ، ایک متحرک اور فعال شعری نظریے کی روشنی میں ہمارے سامنے لاتا ہے اور غالب کی شاعری کے اولین نقوش (نسخۂ حمیدیہ) سے لے کر ان کے فکری بلوغ کی منزل (متداول دیوان) تک ایک منطقی تسلسل کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ غالب پر سرور صاحب کے دوسرے مضامین کی طرح یہ مضمون بھی غالب کی تفہیم کے نو دریافت پہلوؤں سے ہمیں متعارف کراتا ہے۔ علم و عرفان اور فکری نتائج سے قطع نظر اس مضمون کی خاص ہیئت تنقید کو تخلیق کی اس سطح تک لے جاتی ہے جہاں دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔

سلامت اللہ خاں، ابن فرید اور ڈاکٹر وارث کرمانی کے مضامین غالب کی تہ دار شخصیت کی رمزیت اور پیچیدگی کا احاطہ قابل قدر علمی اور فکری متانت اور بصیرت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی نے "یک عمر از شوخیٔ عنواں اٹھائیے" کے عنوان سے ایسی دو سو کتابوں کی فہرست مرتب کی ہے جن کے عنوانات کلام غالب سے ماخوذ ہیں۔ کتابوں اور مصنفین کے نام کے ساتھ انھوں نے وہ اشعار بھی نقل کر دیے ہیں جن سے استفادہ کیا گیا ہے۔ غالب کی مقبولیت اور ہمہ گیری کا یہ پہلو بھی دلچسپ ہے۔

اساتذہ میں عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر منظر عباس نقوی اور طلبہ میں بشیر بدر اور ذکاء الدین شایاں کے مضامین بھی محنت سے لکھے گئے ہیں اور غالب کی نئی تشکیل کا سامان رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے ناموں کی شمولیت سے بھی اس نمبر کا وزن بڑھا ہے۔ ڈاکٹر آرزو نے علی گڑھ میں محفوظ غالب کی تحریروں، تصاویر اور ان سے متعلق دوسرے نوادر کا تعارف اپنے مضمون میں کرایا ہے۔

بیشتر طلبہ کی کوششیں ذہانت، محنت اور مطالعے کے اس معیار کا پتہ دیتی ہیں جو علی گڑھ میگزین کی روایت بن چکا ہے۔ نمبر میں متعدد تحقیقی عکس اور تصاویر بھی شامل ہیں۔ بشیر بدر نے علی گڑھ میگزین میں غالب سے متعلق شائع شدہ مضامین کا اشاریہ، میگزین کے مدیروں کی مکمل فہرست اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں میگزین کے اجراء کے پہلے صفحے کا عکس شامل کر کے اس نمبر کو مزید تاریخی اہمیت عطا کی ہے۔ ایک حصے میں معاصر شعرا کے ان اشعار کا انتخاب بھی شامل ہے جو غالب کی زمین میں کہے گئے ہیں اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی زمین نے اپنے ورثا کو حسن و معنی کی نئی زمینوں سے کس طرح متعارف کرایا ہے۔ سرور صاحب، خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر، شہریار، باقر مہدی، ڈاکٹر عشرت انور، ذکاء الدین شایاں اور بشیر بدر کے اشعار بہت خوب ہیں۔

صوری محاسن کے اعتبار سے بھی یہ نمبر وقیع ہے۔ سرورق پر گجرال کی بنائی ہوئی غالب کی دلآویز تصویر ہے۔ یہ نمبر چھ روپے میں انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

صفحہ ۱۱ سے آگے

ان کی تازہ کشمیری کہانی "خون" پڑھ کر سنائی۔ شمیم احمد شمیم، غلام محمد بادن، سراج الدین پنجابی اور حبیب اللہ شاعر نے کہانی کو پسند کیا اور اسے خوبصورت اور اچھی کہانی قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ کشمیری ادب میں انسان کے چاند پر پہنچ جانے کا ذکر پہلی بار کہانی میں کیا گیا ہے یہ اس کی خاص خوبی ہے۔

اجلاس میں شریک ہونے والوں کے نام درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر شکیل الرحمن، شمیم احمد شمیم، پیر عبد الاحد، پیر غیاث الدین، ریاض الدین پنجابی، ڈاکٹر شنکر رینہ، عبد الستار رنجور، نور شاہ، چمنی لال رتل، جے۔ بی۔ شنگلو، غلام محمد بادن، سوم ناتھ زتشی، سید منظور احمد، حبیب اللہ شاعر، آفاق احمد اور جگن ناتھ آزاد۔

● حبیب اللہ شاعر

مالک انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ۔ پرنٹر و پبلیشر سید بنیاد علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا